سورة الجمعة

یہ مدنی ہے اس میں گیارہ آیات ہیں۔ ابن عباسؓ نے کہا یہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اسی طرح ابن زبیرؓ سے مروی ہے مسلم اور اہل سنت نے ابی ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو جمعہ میں سورہ جمعہ اور اذا جائک المنافقون پڑھتے سنا'' اور انہوں نے ابن عباسؓ سے روایت کیا اور بیہقی نے جابر بن سمرة سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کو مغرب کی نماز میں قل یاایھا الکافرون وقل ھو اللہ احد پڑھتے تھے اور عشاء کی نماز میں جمعہ کی شب سورة الجمعہ اور منافقون پڑھا کرتے تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مکی سورة ہے علامہ ابوحیان نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ یہ غلطی ہے کیونکہ یہود کا معاملہ اور لوگوں کا جمعہ کے اندر منتشر ہونا صرف مدینہ میں ہوا تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱) **يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ** (ترجمہ:۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے اللہ کی تسبیح کرتی ہے) یعنی اس کی پاکیزگی بیان کرتی ہے۔ اور لام زائدہ ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا۔ تسبیح کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ وہ تنزیہہ ہے یعنی آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ اس کی تقدیس کرتی ہے۔ ابواسحاق نے کہا اور کہا جاتا ہے کہ ہر وہ شئے جسے اللہ نے تخلیق کیا ہے اس کے حمد کی تسبیح کرتی ہے۔ چھت اور دروازہ کی آواز بھی تسبیح ہی ہے۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ کہ انہوں نے جو یہ کہا ہر وہ شئے جسے اللہ نے پیدا کیا اس کی حمد کی تسبیح کرتی ہے اس لئے کہ ایک اور جگہ اللہ نے فرمایا تسبح له السموات السبع والارض ومن فیھن الخ (الاسراء ۴۴) ہر شئے زمین وآسمان کی اس کے حمد کی تسبیح کرتی ہے۔ لیکن تم تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو کیونکہ ان میں سے بعض اشیاء حس وحرکت نہیں رکھتیں۔ اور نطق وشعور بھی نہیں تو پھر کیسے ان کی تسبیح کو جانا جاسکتا ہے لیکن اللہ ان کی تسبیح کو جانتا ہے۔ اس لئے کہ اسی نے انہیں پیدا کیا ہے۔ پھر انہیں ہدایت دی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے اعطی کل شئی خلقه ثم ھدی۔ (طٰہٰ ۵۰) یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ نے ہر شئے کو شعور وعلم عطاء کیا ہے۔ اگر وہ انہیں علم وشعور عطا نہیں کرتا تو انہیں ہدایت کیوں کر دیتا اس لئے کہ ہدایت اسے نہیں ملتی جسے شعور نہ ہو۔ پس ثابت ہوا کہ ہر شئی کے پاس شعور ہے جسے اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اسے عطا کیا ہے پس اعطی کا مفعول ثانی محذوف ہے اور وہ شعو ہے اور بعض نے کہا تسبیح سے مراد ''عبادت'' ہے اور اسی کی طرف اللہ نے اشارہ کیا الم تر ان اللہ یسجد له من فی السموات ومن فی الارض ۔الخ (الحج ۱۸) پس مخلوقات کا سجود ہی عبادة ہے اور بعض نے کہا تسبیح سے مراد ''خشوع'' ہے اور یہ معنی جمیع مومنات پر صادق ہیں۔ کیونکہ مخلوقات کی تمام اجناس' انواع اور اشخاص میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع کرنے والا ہے اور جھکنے والا ہے۔ **الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ** (ترجمہ:۔ بادشاہ ہے ہر نقص ہر عیب سے پاک ہے' زبردست ہے حکمت والا ہے) سورہ فاتحہ میں ''الملک'' کی تفسیر گذر چکی ہے۔ اور

جمہور نے زیر کے ساتھ اور جو اس کے بعد ہے زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ابو وائل اور ابوالدینار نے پیش کے ساتھ ''ھو'' کی اضمار پر پڑھا ہے۔اور ''القدوس ''وہ جو نقائص سے پاک ہو اور صفاتِ کمال سے موصوف ہو اور کہا جاتا ہے کہ ''القدوس'' فُعُّول کے وزن پر ''قدس'' سے ہے۔اور قدس طھارۃ ہے۔سیبویہ ''فا'' پر زبر کے ساتھ سبوح اور قدوس پڑھتے تھے اور اسی طرح ابو دینار اور زید بن علی نے بھی قاف پر زبر کے ساتھ پڑھا ہے لیکن جمہور نے اسے پیش ہی کے ساتھ پڑھا ہے۔اور الحیاتی کا قول ہے سبوح اور قدوس کے پیش پر اجتماع ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا اس پر زبر بھی جائز ہے۔ثعلب نے کہا کہ فعّول کے وزن پر سارے اسم مفتوح الاول (زیر سے شروع) ہوتے ہیں مثلاً سفّود'وسمّور'تنور سوائے السبوح اور القدوس کے'ان دونوں میں زیادہ تر ''پیش'' ہے اور کبھی زبر بھی اور کبھی زیر بھی مروج ہے۔اور اسی طرح پیش کے ساتھ الزروح یہ بھی مبالغہ میں سے ہے۔اور کبھی زبر بھی لایا جاتا ہے۔ازہری نے کہا کہ اللہ کی صفات میں قدوس کے علاوہ کوئی بھی لفظ پیش کے ساتھ نہیں آیا۔اور اس کے معنی ہیں الطاھر المنزہ عن العیوب والنقائص یعنی عیوب ونقائص سے پاک ومنزہ اور فعول مبالغہ میں ہے اور کبھی قاف پر زبر لایا جاتا ہے لیکن یہ زیادہ نہیں ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے معنی ہیں مبارک۔صاحب الکشاف نے کہا کہ اللہ تعالیٰ عزوجل کی صفات کو علی المدح پیش کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔گویا یہ کہا گیا ہے کہ وہ بادشاہ بے عیب ہے۔اور اگر منصوب (زبر کے ساتھ) پڑھتا تو زیادہ مناسب ہوتا ہے۔عربوں کے قول کی طرح الحمدلله اهل الحمد۔اور العزّ دراصل ہے القوۃالشّدۃاور الغلبة الرفعة اور الا متناع۔زجاج نے کہا العزیز یعنی الممتنع جس پر کوئی شئے غالب نہ آسکے۔اور کسی اور نے کہا وہ القوی الغالب کل شئی ہے اور کہا جاتا ہے لیس کمثله شیء وہ جس کے جیسی کوئی شئی نہ ہو اور ممکن ہے کہ اس کے معنی ہوں المعز یعنی وہ جو اپنے بندوں میں جسے چاہے عزت عطاء کرے۔اور ابن کثیر نے اسماء الٰہی کے بارے میں کہا کہ الحکم 'والحکیم بمعنی الحاکم ہے اور وہ القاضی ہے یہ فعیل بمعنی فاعل ہے یا یہ وہ ہے جو اشیاء کو حکم فرمائے ہیں اور انہیں محفوظ رکھے۔پس وہ فعیل ہے بمعنی مفعل اور کہا جاتا ہے کہ اس کے معنی ہیں ذو الحکمة اور جس کے معنی ہیں اشیاء کے حقائق وخواص اور لواحق کی صحیح طور پر معرفت۔

(۲) **هُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ** (ترجمہ:۔وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں بھیجا) یعنی ان کی طرف بھیجا۔صاحب اللسان نے کہا کہ ابو اسحاق نے کہا امی کے معنی ہیں المنسوب الی ما علیه جبلته امه اپنی اصل کی جبلت (فطرت) کی طرف منسوب) یعنی لکھتا پڑھتا نہیں۔پس وہ اس اعتبار سے کہ وہ لکھتا پڑھتا نہ ہو تو وہ امّی ہے کیونکہ لکھنا پڑھنا کسب کردہ چیز ہے۔پس گویا وہ شخص جس حیثیت وحالت پر پیدا کیا گیا ہے اسی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔یعنی جس حالت پر اس کی ماں نے اسے جنم دیا ہے۔لکھنے پڑھنے والے لوگ اہل طائف تھے۔انہوں نے اہل حیرہ کے ایک فرد سے سیکھا تھا اور اہل حیرہ نے اس فن کو اہل انبار سے سیکھا تھا۔اور حدیث شریف میں ہے کہ ہم امّی امت ہیں نہ ہم لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں۔آپ کے اس ارشاد سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی ماں کی طرف سے اصل جنم کی حالت میں ہیں کتاب وحساب کو انہوں نے نہیں سیکھا پس وہ اپنی پہلی فطرت پر ہیں۔اس

آیت میں خاص طور پر امیوں کا ذکر کرنا غیر امیوں میں آپ کی بعثت کے منافی نہیں ہے۔ البتہ اللہ کا امّیوں پر احسان کچھ زیادہ ہی ہے جیسے کہ اللہ نے ارشاد فرمایا **وانه لذكر لک ولقومک (الزخرف ۴۴)** حالانکہ وہ دوسروں کے لئے بھی ذکر ہے اور وہ اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں اور اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے **وانذر عشیرتک الاقربین (الشعراء ۲۱۴)** کیونکہ اللہ نے جس طرح کلمہ خطاب کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اسی طرح سے **قل یاایهاالناس انی رسول الله الیکم جمیعا (الاعراف ۱۵۸)** اور **وما ارسلنک الا کافة للناس** (سبا۲۸) بھی فرمایا ہے بلکہ تمام جنات کی طرف بھی آپ رسولؐ ہیں جیسے کہ سورہ الجن اس پر دلالت کررہی ہے۔ پس یہ آیت حضرت ابراہیم کی دعا۔" **ربنا وابعث فیهم رسولا منهم یتلوا علیهم آیاتک ویعلمهم الکتاب والحکمة ویزکیهم** "(**البقرة ۱۲۹**) کی قبولیت پر دلالت کرتی ہے پس اللہ نے اسے مبعوث فرمایا اور امیین کو حذفِ نسبت کے بھی پڑھا گیا ہے۔ **رَسُوْلاً مِّنْهُمْ** (ترجمہ:۔ان ہی میں سے ایک رسول) یعنی ان ہی میں سے جیسا کہ اللہ نے فرمایا **ولقد جاء کم رسول من انفسکم** (التوبہ۱۲۸) کہا جاتا ہے کہ اشراف العرب میں کوئی ایسا زندہ نہ تھا مگر جس سے رسول اللہ ﷺ کی قرابت داری نہ ہوتی ہو۔ **يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ** (ترجمہ:۔ جو ان کو اس کی (اللہ کی) آیات سناتا ہے) آیات اللہ سے مراد قران مجید ہے یعنی پڑھتا ہے۔ **وَيُزَكِّيْهِمْ** (ترجمہ:۔اور انہیں پاک کرتا ہے) کفر کے میل کچیل اور گناہوں کی غلاظت ونجاست سے انہیں پاک صاف کرتا ہے۔ اور خبائث جاہلیہ سے بھی انہیں خلاصی دیتا ہے۔ **وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ** (ترجمہ:۔اور کتاب کی تعلیم دیتا ہے) یعنی تلاوت کے بعد انہیں قرآن کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن کے حقائق احکام کی تلقین کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کتاب سے مراد فرائض ہیں۔ **وَالْحِكْمَةَ** (ترجمہ:۔اور دانش کی) یعنی سنت اور یہ دونوں تزکیہ کے اسباب ہیں **وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ** (ترجمہ: اور بلاشبہ پہلے) یعنی ان کی (رسول اللہؐ) بعثت سے پہلے **لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ** (ترجمہ:۔کھلی گمراہی میں تھے) ان مخففه ' مثقلة کی جگہ 'ان ' بات کی دلالۃ کرتی ہے کہ وہ لوگ گمراہی میں تھے اس سے زیادہ گمراہی نہیں دیکھی گئی۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ عرب قدیم زمانے میں دین ابراہیم سے چمٹے ہوئے تھے۔ برہتہ کے بعد مدت مدید سے انہوں نے اس دین کو بدل دیا تھا اور مشرک ہوگئے تھے۔ اور ایسی بدعتیں شروع کردی تھیں جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی تھی اور اسی طرح اپنی کتابوں کو تبدیل کردیا تھا اور ان میں رد وبدل اور تحریف کردی تھی۔ پس اللہ نے محمد ﷺ کو شرع مبین کے ساتھ تمام انسانوں کے اہم امور کی خاطر بھیجا۔ یعنی ان کی اصلاح معاش ومعاد کے تصور کو بدل دیا اور ان کو اس طرف بلانے کی دعوت دی جو انہیں جنت سے قریب کرنے والی تھی۔ ان کے تمام شکوک اور شبہات کو مٹانے والی تھی۔ اللہ نے انہیں یکجا کردیا اور اسی کی حمد وثناء ہے تمام تر تعریفوں کے ساتھ جو انبیاء سابقہ میں تھیں۔ پس اس سے ظاہر ہوا کہ نبی یا خلیفہ کو اللہ نہیں بھیجتا مگر ایسے زمانے میں کہ لوگوں نے ایمان کو کفر سے اور خیر کو شر سے بدل دیا ہو۔ اور وہ بدعتوں اور خواہشات کی طرف مائل ہوگئے ہوں۔ پس جب لوگ ان بری عادات کے عادی ہوجائیں تو اللہ بھیجتا ہے ایسی ہستی کو جو انہیں صراط مستقیم اور راہ حق کی طرف رہنمائی کرے۔ پس نبی یا اس کے قائم مقام کی بعثت کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے۔

(۳) **وَّاٰخَرِیۡنَ مِنۡهُمۡ** (ترجمہ:۔اوران کے دوسرے لوگ) امیین پر عطف ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو امیین اوران ہی کے دوسروں میں مبعوث فرمایا۔ **لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ** (ترجمہ:۔جو ابھی تک ان سے ملحق نہیں ہوئے) صاحب کشاف نے کہا کہ ان سے نہیں ملے اوران سے ملیں گے اور یہ لوگ وہ ہیں جو صحابہؓ کے بعد ہوں گے۔اور **یعلمهم** میں موجود منصوب ضمیر پر عطف کرتے ہوئے **آخرین منهم** کو نصب دینا جائز ہے عبارت یہ ہوگی۔**یعلمهم ویعلم آخرین**۔چونکہ تعلیم جب آخری زمانے تک چلتی ہوئی آئے تو ہر بعد میں آنے والا پہلے والے کے ساتھ جڑا ہوگا پس گویا وہ ایسا ہے جیسے کہ ان میں سے ہر فرد اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے تو ان پر سورۃ الجمعہ نازل ہوئی۔ جب یہ آیت تلاوت کی گئی "**و آخرین منهم لما یلحقوا بهم**"، تو لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہیں۔آپؐ ان کی طرف رجوع نہیں ہوئے یہاں تک کہ تیسری بار سوال کیا گیا اور ہمارے درمیان سلمان فارسیؓ بھی تھے پھر آپ نے فرمایا اگر ایمان ثریا کے پاس ہوگا (یعنی آسمان پر ہوگا) ان کی قوم کے کچھ لوگ یا کوئی ایک آدمی پالے گا۔ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اسے بیان کیا ہے جو کہ بخاری اور مسلم میں مروی ہے۔اور ابن ابی حاتم نے سہل بن سعد الساعدی سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بلاشبہ میری امت کے مرد وعورتیں جو اصلاب (تین بار فرمایا) میں ہیں جنت میں بغیر حساب داخل ہوں گے پھر آپ نے یہ آیت پڑھی **و آخرین منهم لما یلحقوا بهم** یعنی اس سے مراد محمد ﷺ سے باقی رہنے والے اوران کے بھی پیچھے آنے والے ہیں۔اور دونوں حدیثیں مرفوع ہیں رسول اللہ ﷺ تک۔اور مجاہد نے اور ابن جبیر نے کہا اس سے مراد روم وعجم ہیں۔مجاہد نے بھی کہا اور عکرمۃ اور مقاتل نے کہا اس سے مراد تابعین ہیں ابنائے عرب میں سے اور مجاہد'ضحاک' ابن حیان نے کہا اس سے مراد لوگوں کے گروہ ہیں۔ابن عمر نے کہا اس سے مراد اہل یمن ہیں اور مجاہد نے یہ بھی کہا کہ اس سے مراد ابنائے الاعاجم (عجم کے لوگ) ہیں اور ابن زید سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ تابعین ہیں اور ضحاک سے یہ بھی مروی ہے کہ عجم مراد ہے۔اوران اقوال کا منشاء رائے اور خیال کا اظہار ہے اسی لئے مجاہد کی رائے ایک قول پر نہیں رہی۔بلکہ ان سے مختلف اقوال مروی ہیں۔اور اسی طرح کا حال ضحاک کا ہے لہذا ان آراء پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔پس ہمیں لازم ہے کہ ہم ان دونوں حدیثوں کے بارے میں بات کریں۔پہلی حدیث جو ابو ہریرہؓ سے مروی ہے وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہؓ کے اس بار بار کے سوال سے راضی نہیں تھے اور اسی لئے انہوں نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا جب پہلی بار انہوں نے پوچھا یہ لوگ کون ہیں یا رسول اللہ ﷺ یہاں تک تین بار سوال کیا تب عمومی انداز سے جواب دیا اور فرمایا اگر ایمان ثریا پر پہنچ جائے گا تو ان میں سے لوگ وہاں پہنچ جائیں گے اور کوئی شخص اور سلمان فارسیؓ کی طرف اشارہ فرمایا۔پس اس جواب سے ظاہر ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ اس بیان کے ذریعہ جواب دیں جس سے ابہام کے پردے کھلیں جو کہ مقصود ہے پس آپ نے مجمل جواب دیا اور اسے مبہم ہی رکھا اور جو کچھ اس خبر (حدیث) سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "**و آخرین منهم لما یلحقوا بهم**" سے اللہ کی مراد سوائے غیر عرب کچھ اور نہ تھا۔اور اسی کی طرف امام رازیؒ اپنی تفسیر میں گئے ہیں اور انہوں نے کہا کہ امیین سے مراد عرب اور

آخرین سے مراد ان کے سوا دوسری اقوام ہیں ۔ جہاں تک دوسری حدیث کا سوال ہے جسے سہل بن السعدؓ نے روایت کیا۔اس میں حدیث ابی ہریرہؓ سے زیادہ ابہام واخفاء ہے اس لئے کہ آپ نے فرمایا" **ان فی اصلاب اصلاب اصلاب رجال ونساء من امتی یدخلون الجنة بغیر حساب**" اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی **وآخرین منهم لما یلحقوا بهم**" آپ ﷺ نے اس حدیث کے بارے میں وضاحت بھی نہیں فرمائی کہ وہ لوگ عرب میں سے ہوں گے یا غیر عرب میں سے ہوں گے۔اونہ ہی ان کا زمانہ متعین فرمایا بلکہ کلمہ "اصلاب" تین بار ادا کیا۔پس اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ لوگ ان کے عہد سے بہت زمانے بعد ہوں گے۔مختصر یہ کہ ان دونوں حدیثوں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اللہ کی "**وآخرین منهم**" سے کیا مراد ہے۔کیونکہ یہ خبر "خبر مغیب" (آنے والے دور کی خبر) ہے اور ہر خبر مغیب اپنے الفاظ سے یہ ظاہر نہیں کرتی کہ اس کی مراد کیا ہے۔کیونکہ اس میں دراصل اللہ کی طرف سے امتحان ہے۔ جس کے ذریعہ وہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔اوران کو تکلیف میں ڈالتا ہے۔پس اس کے معنی نہیں ظاہر ہوتے سوائے اس پر جس کا سینہ اللہ نے نور معرفت وایمان سے کھول دیا ہو۔پس اس کی مراد اس کے قلب پر منکشف ہو جاتی ہے اور جس کو یہ نور اللہ نے عنایت نہیں کیا ہوتو اس کے قلب میں شکوک کے ظلمات اور اوہام کے حنادس (تاریکیاں) رہ جاتی ہیں۔پس وہ اس کے معنی نہیں سمجھتا اور نہ ہی اس کے مغز کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔کیا آپ نے توراۃ میں مذکورہ موسیٰؑ ، عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا بیان نہیں دیکھا۔اللہ تعالیٰ نے ان کے ظہور کے بارے میں خبریں ایسے کلمات میں دی ہیں جو کہ مشکل ہیں اور مجمل ہیں ان کے حقیقی معنی کسی ایک نبی پر صادق نہیں آتے وہ معانی جو علامہ تفتازانی نے شرح المقاصد میں بیان کیا ہے۔اور کہا ان کے ظہور کے بارے میں آسمانی کتابوں میں بیان کیا گیا جیسا کہ توراۃ میں ذکر کیا گیا ہے۔اللہ طور سیناء پر آیا اور سعیر سے چمکا اور فاران کے پہاڑوں سے بلند ہوا اور یہ کہ اللہ نے موسیٰؑ سے فرمایا میں ان کے لئے تیری طرح ان کے بھائیوں کی اولاد سے ایک نبی بھیجوں گا اور میں اپنا قول اس کے منہ میں جاری کروں گا اور وہ انہیں وہی کہے گا جو میں کہوں گا نیز اس میں یہ بھی ہے کہ ہاجرہ بچے جنے گی اس کے بچوں میں ایک ایسا ہوگا جس کا ہاتھ سب سے اوپر ہوگا اور سب کے ہاتھ اس کی طرف خشوع کے ساتھ پھیلیں گے۔پس ان میں سے پہلا جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے اللہ طور سینا پر آیا اور ظاہر ہے آنا اور جانا صفاتِ جسمانیات میں سے ہے۔اور اللہ تعالیٰ جسم نہیں ہے اور نہ ہی جسمانی ہے پس اس کے حق میں محال ہے کہ اسے جسمانی صفات سے متصف مانا جائے۔پس اس کے یہ معنی صحیح نہیں ہوں گے سوائے اس کے یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا کوہِ طور پر آنا اس کی صفات میں سے ایک صفت کا ظہور ہے۔جیسے کہ صفتِ کلام اور وہ توراۃ ہے جو موسیٰ پر نازل کیا گیا ہے یا اس سے اللہ کے کسی نائب کا آنا مراد لیا گیا ہے۔اور وہ موسیٰ ہیں جب وہ نبوت ورسالت سے موصوف ہوئے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا بھڑکتی آگ سے اشراق بھی بعید از قیاس ہے۔کیونکہ اشراق صفتِ اجسام میں سے ہے جیسے کہ سورج اور برق۔اس سے یہ معنی اللہ سے منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔سوائے اس کے کہ کہا جائے کہ اس کے اشراق سے مراد ظہور انجیل ہے۔جو حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئی یا حضرت عیسیٰ کی بعثت ہے۔اور اسی طرح اس کا فاران کی چوٹیوں (پہاڑوں) سے نمودار ہونا۔پس اس سے مراد یا تو ظہور قرآن ہے یا مکہ میں محمد ﷺ کی بعثت ہے۔پس فاران

سے مراد مکہ ہے جیسا کہ اس کے مقام پر ذکر کیا گیا ہے۔ پس جو معنی ہم نے واقع کی مطابقت کی وجہ سے بیان کئے ہیں وہ اس کے مجازی معنی ہیں۔ علاوہ ازیں اس جملہ میں صیغۂ ماضی استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد امور لئے گئے جو مستقبل میں ظہور پذیر ہوں گے۔ پس اس مقام پر اس طرح بیان کیا جانا خفاء کو خفاء سے اضافہ کرتا ہے۔ پس انسان ان کے معنی نہیں سمجھ سکتا سوائے اس شخص کے جسے اپنے پاس سے اللہ نے نور معرفت وہدایت عطا کی ہو۔ اور یہ اس کا فضل ہے جسے چاہے عطاء کرے اور اللہ زبردست فضل کرنے والا ہے۔ جہاں تک اس شخص کا تعلق ہے جو ان کے معانی نہیں سمجھ سکتا اور ان جیسی خبروں کے حقیقی معنوں تک رسائی نہ پا سکتا ہو وہ راہِ راست پر بھٹک جاتا ہے وہ جہالت کے بندھنوں میں جکڑ جائے گا اور ضلالۃ کی زہریلی پھنکاروں کا اسیر ہو جائے گا۔ ان کی قیود سے کبھی نہیں نکل سکے گا بس اس کے نزدیک اخبار مغیبہ غیر مفید جملے اور مجہول قسم کی غیر واضح پہیلیاں بن جائیں گی کیونکہ یہ کسی پر وارد میں ہوا اور نہ ہی سنا گیا کہ اللہ طور سینا سے آیا یا سعیر سے چمکا یا فاران کے پہاڑوں سے نمودار رہا۔ اور قیامت کے دن تک انتظار کرتا ہوا رہ جائے گا اور انبیاء وخلفاء میں سے کسی پر بھی ایمان نہ لائے گا اور یہ اس لئے کہ وہ اس کے لغوی اور وضعی معنی کے علاوہ کسی چیز کا ادراک نہیں رکھتا اور اس قسم کی خبریں ان معنی کی متحمل نہیں ہوسکتی کیونکہ عجیب وغریب قسم کے استعارے ہیں ان الفاظ سے ان کے دور والے لوازم مراد ہیں۔ اسی طرح تمام غیبی خبروں کے بارے میں ہے پس جملہ ثانی میں اس قول سے " **من بنی اخوتهم مثلک الاخوة البعيدة** " سے دور والے بھائی مراد ہیں۔ کیونکہ ان میں محمد ﷺ کے آنے کی خبریں ہیں اور وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہیں اور اگر بھائیوں سے مراد نزدیکی بھائی مراد لئے جائیں تو لازم آئے گا کہ جس کے آنے کی خبر دی جارہی ہے وہ لاوی بن یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہو کیونکہ موسیٰ لاوی کی اولاد میں سے تھے۔ پس لازم ہوگا کہ موسیٰؑ کے بھائی لاوی کی اولاد میں سے ہوں۔ پس یہ خبر محمد ﷺ پر صادق نہیں آئے گی اور اگر اس بھائی چارے سے مراد دور کا بھائی چارہ ہو اور اسی طرح اس کا کہنا کہ ہاجرہ بچے جنے گی اور اس کے ایک بچہ کا ہاتھ سب پر ہوگا یہ اسمیں ایک انوکھا استعارہ ہے اور اس سے مراد یہ ہو کہ اسمٰعیل کی اولاد میں سے ایک شخص جس کا ہاتھ سب پر ہوگا تو پھر اس معنی کے اعتبار سے توریت کی یہ خبر نبیؐ پر صادق آتی ہے اس لئے کہ آپ ﷺ ہی بنی اسمٰعیل میں سے ہیں اور اگر اس سے حقیقی معنی مراد لیا جائے تو پھر اس جملے کے معنی درست نہیں ہوں گے کیونکہ ہاجرہ زوجہ ابراہیمؑ موسیٰؑ پر توریت کے نزول سے پہلے فوت ہو چکی تھی اور حضرت موسیٰؑ حضرت ابراہیمؑ کے بہت صدیوں کے بعد پیدا ہوئے تھے لہٰذا یہ قول کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ ہاجرہ بچہ وغیرہ جنے گی کیونکہ یہ خبر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہاجرہ سے پیدا ہونے والا بچہ توریت کے نزول کے زمانے سے بھی آئندہ زمانے میں ہوگا اس بیان سے یہ ظاہر ہوا کہ اس قسم کی خبریں اپنے حقیقی معنوں پر دلالت نہیں کرتیں۔ پس جب آپ یہ سمجھ گئے تو ہم کہتے ہیں "**وآخرين منهم لما يلحقوا بهم**" کے معنی یہ ہیں کہ **هو الذى بعث فى آخرين منهم رسولا لما يلحقوا بهم** اور **بعث فى آخرين منهم رسولا** سے مراد محمد ﷺ ہیں یعنی اللہ نے جس طرح محمد ﷺ کو امیین میں رسول بنا کر بھیجا اسی طرح انہیں دوسروں میں بھی رسول بنا کر بھیجا۔ پھر دوسروں میں آپ ﷺ کا بطور رسول مبعوث ہونا اس بات سے خالی نہیں ہے کہ آپ ﷺ امیین میں مبعوث ہونے کے بعد بعینہ دوسروں میں بھی مبعوث

ہوں یا دوبارہ بھیجے جانے سے مراد امت میں آپ کے مثل کا بھیجا جانا مراد لیا جائے اور پہلی بات دلائل سے باطل ہے۔ کیونکہ اس سے تناسخ لازم آتا ہے جو عقلی و نقلی دلائل کی رو سے مردود ہے جیسا کہ اس کے مناسب مقام پر بیان بھی کیا گیا ہے۔ پس باقی رہ گئی دوسری بات ۔وہ یہ آپ کی بعثت سے آپ کے مثل کی بعثت مراد لی جائے اور آپ کے مثل سے مراد ائمہ مجتہدین مراد لینا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ معصوم نہیں ہوتے۔ پس وہ آپ کی مثل بھی نہیں ہوں گے اور اس اعتبار سے بھی کہ وہ امت کے اول دور میں تھے لہٰذا ان پر " آخرین منهم" کا اطلاق نہیں ہوتا۔ پس آپ ﷺ کے مثل سے مراد امام مہدی موعود علیہ السلام ہی ہیں جن کے آنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور ہمارے اس نظریہ کی تائید احادیث صحیحہ مرفوعہ متواترہ بالمعنی کے ذریعہ ہوتی ہے جیسے کہ ہم نے بعض رسائل میں بیان کیا ہے۔ **وَهُوَ الْعَزِيْزُ** (ترجمہ:۔وہ غالب ہے) یعنی زبردست عزت والا ہے **الْحَكِيْمُ** (ترجمہ: حکمت والا ہے) یعنی حکمت و علم میں کامل ہے۔

(۴) **ذٰلِكَ** (ترجمہ: اور یہ) یعنی اہل بیت نبیؐ میں سے ایک شخص کا اس طرح اصلاح پذیر ہونا کہ وہ اللہ کی طرف دعوت دینے کے معاملہ میں آپ کی مثل بن جائے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "مہدی میرے اہل بیت سے ہے اللہ سے اسکی ایک ہی رات میں اصلاح فرمادے گا اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ **فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ** (ترجمہ:۔اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطاء کرتا ہے اور اللہ زبردست فضل والا ہے) کوئی بھی فضل اس کے مساوی اور قریب نہیں ہوسکتا۔

(۵) **مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ** (ترجمہ:۔ان لوگوں کی مثال جن پر توراۃ کا بوجھ ڈالا گیا) اور وہ یہود ہیں۔ **ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا** (ترجمہ:۔پھر انہوں نے اسے نہیں اٹھایا (عمل نہیں کیا) یعنی انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا جس کا توراۃ میں انہیں کرنے کو کہا گیا تھا۔ پس وہ **كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا** (ترجمہ: اس گدھے کی مثال ہے جس نے کتابوں کو اٹھا رکھا ہے) جمہور نے **حملوا** مشدد پڑھا ہے مفعول کے طور پر لیکن یحییٰ بن یعمر اور زید بن علی نے فاعل کے طور پر مخفف پڑھا ہے۔ ان کے اوصاف کی تشبیہ گدھے کی صفت سے دی گئی ہے جس نے اپنی پیٹھ پر کتابیں اٹھا رکھی ہیں اور وہ نہیں جانتا کہ اس پر کیا ہے کتابیں ہیں، پتھر ہیں یا لکڑیاں اور اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے۔

سروایل للاشعار لاعلم عندهم بجید ها الا کعلم الا باعر

لعمرک ما یدری البعیر اذا غدی بادساقه اور اح ما فی الغرائر

اور عبداللہ نے اسے نکرہ پڑھا ہے۔ اور مامون بن ہارون نے **یحمّل** کو میم کی تشدید پر محمول کیا ہے مفعول کی بناء پر۔ اور جمہور نے **الحمار** کو معرفہ پڑھا ہے۔ **یحمل** کو فاعل پر مبنی کرتے ہوئے مخفف پڑھا ہے۔ **یحمل** منصوب ہے حال ہونے کی وجہ سے اور معنی یہ ہیں۔ یہ لوگ جنہوں نے وہ کتاب اٹھا رکھی ہے جو ان پر اللہ نے نازل کی ہے۔ اس کی مقتضاء پر عمل نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ اس کی انہوں نے تاویل کی اور اس میں تحریف کی پس ان کا حال بہت زیادہ قبیح ہے اور صورت حال گدھے سے زیادہ بری ہے۔ اس لئے کہ اللہ

نے اسے کل عقل و درایت عطا نہیں کی مگر صرف جزوی۔ مگر یہ لوگ ان کے پاس عقل ہونے کے باوجود وہ فکر نہیں کرتے اور فہم ہے لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ اسی لئے اللہ نے فرمایا یہی لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ اور یہی لوگ غافل ہیں **بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ** (ترجمہ:۔ بری حالت ہے ان لوگوں نے جنہوں ے اللہ کی آیات کو جھٹلایا) صاحب کشاف نے کہا بہت بری مثال ہے اس قوم کی مثال جنہوں نے اس صورت میں تمیز محذوف ہوگی اور فاعل بئس مضمر (پوشیدہ) ہے۔ مثل القوم یہ مخصوص بالذم ہوگا اور سیبویہ نے بالوضاحت کہا ہے کہ وہ تمیز جس کی تفسیر نعم اور بئس یا اس کے قائم مقام الفاظ میں پوشیدہ ضمیر کررہی ہو ایسی ضمیر کا حذف جائز نہیں ہے۔ اورابو حیان اندلسی نے کہا کہ بئس کا فاعل مثل القوم ہے اور "الذین کفروا" یہ مخصوص بالذم' مضاف کے حذف کے ساتھ ہے۔ یعنی مثل الذین اور آیات سے مراد کہا جاتا ہے کہ آیات قرآنی ہیں۔ اس لئے کہ انہوں ے اس میں تحریف کی اور کہا جاتا ہے کہ یہ وہ آیات قرآنی ہیں جنہیں انہوں نے جھٹلایا۔ **وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ** (ترجمہ:۔ اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا ہے) یعنی یہود اور سب سے زیادہ بہتر یوں کہنا ہوگا کہ وہ جنہوں نے انکار وسرکشی کی بناء پر اپنے نفسوں پر ظلم کیا پس اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نہیں دے گا۔ اس لئے کہ اس کے علم میں پہلے ہی آ چکا کہ وہ جس نے اپنی جان پر ظلم کیا پس وہی لوگ اللہ پر ایمان نہیں لائیں گے اور اس لئے صفتہ الموصول عام ہے اور وہ ہے کذبوا بآیات اللہ اور کسی کے مقابلہ میں دوسرے کو یا قوم کی تخصیص نہیں۔

(٦) **قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا** (ترجمہ:۔ کہہ دو اے یہود) یعنی وہ لوگ جنہوں نے یہودیت کو اختیار کیا اور الھود کے معنی ہیں التوبہ۔ اور ھاد یھود یعنی تاب یتوب اور اسی سے تھوّد ہے جس کے معنی ہیں تاب اور رجع الی الحق (یعنی اس نے توبہ کی اور حق کی طرف رجوع ہوگیا) پس وہ ھائد ہے یعنی راجع' اور قوم ہود۔ حائک 'حوک ' بازل اور بزل کی طرح ہے۔ اعرابی نے کہا انی امراء من مدحه ھائد یعنی راجع ۔ پس اللہ کے اس ارشاد گرامی "الذین ھادو" کے معنی میں ہیں راجعوا۔ اور اسی سے زہیر کا قول ہے۔

سوی ربع لم یات فیھا مخافة ولا رھقا من عائد متھود

الرھق یعنی الظلم اور المتھود یعنی المطمئن الیه والراجع اور اس کے معنی ہیں اس کی طرف مطمئن ہونے والا اور راجع ہونے والا۔ اس کے معنی یہ ہیں ممدوح نے غیروں پر ظلم کرکے اپنے مال کو نہیں بڑھایا وہ تو صرف غنیمت کا چوتھا حصہ لیتا ہے بغیر خیانت کے اور ظلم کے اس آدمی کے ساتھ جو اس سے وابستہ ہوا اور اس کی طرف لوٹا اس کے ساتھ مطمئن رہا۔ **اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ** (ترجمہ:۔ اگر تم گمان کرتے ہو کہ بلا شرکت غیرے تم اللہ کے دوست ہو) یہود گمان کرتے تھے کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے دوست ہیں پس اس کی رحمت تمام بنی نوع انسان سے زیادہ ان کے لئے مخصوص ہے اور اسی لئے وہ ان تمام پر فضیلت کے مدعی تھے اور ولایت سے مراد قرب من اللہ ہے۔ پس ولی سے مراد وہ جو قریب ہو۔ اور اللہ کا بندے سے قرب سے

مراد ظلال یعنی (سایہ) صفات الٰہی سے صفاتِ عبد کا روشن ہونا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے اللہ کے راستے کے سالکوں سے کرامتوں کا صدور ہوتا ہے۔ پس ان کے اولیاء مقرب ہوتے ہیں۔ اوران کو دنیا میں ہی قرب الٰہی اگرچہ حاصل ہوتا ہے لیکن کمال قرب اور انتہائے قرب انہیں آخرۃ میں ہی حاصل ہوگا یہ اسلئے کہ ان کی ارواح جسمانیہ مواد اور ھیولہ صفات سے مجرد اور صاف ہوتی ہے۔ **فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ** (ترجمہ:۔تو موت کی تمنا کرو) کیونکہ ''ولی'' اللہ سے کمالِ قرب چاہتا ہے اور یہ حاصل ہوتا ہے صرف موت کے بعد پس وہ موت کو یاد کرتا ہے اور اس کی تمنا کرتا ہے۔ پس موت کی تمنا دراصل اللہ سے قرب کی تمنا ہے۔ جمہور نے تمنوا میں واؤ کو پیش سے پڑھا ہے۔ لیکن ابن یعمر' ابن اسحاق اور ابن السمیقع نے اسے زیر سے پڑھا ہے۔ اور ابن السمیقع سے یہ بھی مروی ہے کہ اس نے زبر سے پڑھا ہے اور کسائی نے عرب بادیہ نشینوں سے سنا ہے کہ وہ واؤ کی جگہ ھمزہ مضمومہ (پیش کے ساتھ) پڑھا ہے۔ جیسے تلوؤن کو تلئون کر کے پڑھنا ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ اگر تم اللہ کے دوست ہو تو اللہ سے تمنا کرو کہ وہ تمہیں موت دے دے' اور فوراً تمہیں دائرہ کرامت کی طرف منتقل کردے جو اس نے اپنے ولیوں کے لئے تیار کر رکھی ہے۔ **اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ** (ترجمہ:۔اگر تم سچے ہو) تمہارے اس زعم میں کہ تم اللہ کے دوست ہو۔

(۷) **وَلَا یَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ** (ترجمہ:۔اور وہ یہ تمنا کبھی بھی نہیں کریں گے بوجوہ اس کے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے بھیجا ہے) جو کچھ کہ انہوں نے کفر اور برے عمل کئے ہیں اس کی وجہ سے اور ان کے اس قول کی وجہ سے کہ عُزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔ اور یہ اعمال انہیں آگ میں ڈالنے کے موجب ہیں تو وہ کس طرح موت کی تمنا کر سکتے ہیں ان کفریات کے ساتھ؟ زمخشری نے کہا لا اور لن دونوں میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ ان میں سے ہر ایک مستقبل میں نفی کے معنی دیتا ہے مگر لن میں تاکید اور تشدید ''لا'' میں نہیں ہے۔ پس کبھی کبھار لفظ تاکید کے ساتھ . ولن یتمنوہ اور کبھی کبھار تاکید کے بغیر ولا یتمنوہ۔ میں کہتا ہوں کہ صاحب کشاف کا قول اس پر دلالت کرتا ہے کہ لا اور لن کے درمیان فرق اس اعتبار سے ہے کہ لا میں نفی محض ہے اور ''لن'' میں نفی تاکیدی وتشدیدی ہے۔ اور ابوحیان نے اپنے قول میں تاویل کی وہ کہتے ہیں کہ یہ لن کے بارے میں اپنے نظریہ کو بدلنا ہے کہ اس کا نظریہ یہ ہے کہ لن تا بیدی (ہمیشگی) نفی کا اشارہ کرتا ہے وہ اس سے جماعت کے نظریہ کی طرف آیا ہے یعنی یہ کہ لن تابیدی نفی کا تقاضا نہیں کرتا۔ البتہ اس کا یہ کہنا کہ لن میں تاکید اور تشدید ہوتی اور لا میں نہیں ہوتی تو یہ بات بھی کسی صادق اللسان شخص کی تائید کی محتاج ہے اور اس نے کہا جب لن کی جگہ لم استعمال کیا جائے گا تو لا یتمنوہ کے قول میں تائید باقی رہے گی پھر وہ نفی محض لا کی طرح ہو جائے گا۔ بعض نحویوں نے جن میں ابن ہشام صاحب المغنی شامل ہیں کہا کہ لن تاکید نفی کا فائدہ نہیں دیتا برخلاف زمخشری اور نہ ہی اس کی تابید اس کے نمونوں کے خلاف اور یہ دونوں دعوی بلا دلیل ہیں۔ اس نے یہ اس لئے کہا کہ نحویوں نے لن کے معنی میں یہ صراحت نہیں کی ہے کہ وہ تاکید نفی کا فائدہ دیتا ہے یا تابید نفی کا۔ اگر وہ تابید کے لئے ہوتی تو ارشاد باری تعالیٰ فلن اکلم الیوم انسیاً میں لفظ الیوم میں منفی کا فائدہ نہ دیتی اور لن یتمونه ابداً میں لفظ ابد کا ذکر کرنا تکراری ہوتا۔ اصل میں اس کے معنی معدوم ہونا ہیں۔ میں کہتا ہوں (قول

مفسر علامؒ) کہ قرآن میں لا اور لن کا استعمال دلالت کرتا ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔اور یہ حق ہے۔ **وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ**) ترجمہ: اور اللہ ظالموں سے باخبر ہے) یعنی ان لوگوں سے جنہوں نے کفر و شرک اختیار کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ پس اللہ جو ان کے قلوب نے کسب کیا ہے۔اس کے حساب سے جزاء دے گا اور موت کی تمنا نہ کرنے پر انہیں نجات نہیں دے گا۔

(۸) **قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ** (ترجمہ:۔ کہہ دو کہ بلا شبہ موت جس سے تم بھاگ رہے ہو) اس ڈر سے کہ وہ تم کو عذاب الٰہی اور عبرتناک سزا میں ڈال دے گی۔ **فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ** (ترجمہ: تم سے مل کر رہے گی) وقت معین پر جو علم الٰہی میں ہے۔اور خبر ان میں ''فا'' اسم ان کے معنی شرط کے طور پر آیا ہے۔جیسا کہ زجاج نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔اور بعض نحوین جیسے کہ فراء نے کہا کہ یہ ''زائدہ'' ہے۔اور زید بن علی کی قرأۃ بھی اس کی تائید کرتی ہے کیونکہ اس نے اسے بغیر فا کے پڑھا ہے۔اور صاحب کشاف کا رجحان ہے کہ یہ استیناف کے لئے ہے۔اور تقدیر کلام یہ ہوگی ''قل ان الموت هو الدی تفرون منه فانه ملا قیکم'' صحیح بات زجاج والی ہے کیونکہ اس میں تکلف نہیں ہے اور دوسروں نے جو کچھ کہا ہے اس کی حاجت نہیں ہے۔ **ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ** (ترجمہ:۔ پھر تمہیں عالم الغیب کی طرف لوٹا دیا جائے گا) یعنی خفیہ باتوں اور امور **وَالشَّهَادَةِ** (ترجمہ:۔ (اور عالم) شہادت) یعنی علانیہ اور یہ یوم قیامت ہوگا۔ **فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (ترجمہ:۔ پھر وہ تمہیں آگاہ کرے گا اس سے جو تم کرتے رہتے تھے) اعمالِ قبیحہ میں سے جیسے کہ شرک توراۃ میں تحریف و تبدل۔اور یہ آیت اگرچہ یہود کے بارے میں ہے مگر اس کا حکم ہر اس آدمی کو شامل ہوگا جس میں یہ صفات مذکورہ پائی جائیں گی کیونکہ احکام اوصاف پر مرتب ہوتے ہیں جو کہ ان کا سبب بنتے ہیں۔اللہ نے فرمایا یا۔

(۹) **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا** (ترجمہ:۔ اے ایمان والو) یعنی اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کے مطابق ایمان لانے والو! **اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ** (ترجمہ جب نماز کے لئے پکارا جائے) اور نداء سے مراد دوسری اذاں ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دی جاتی تھی جب آپ اٹھتے تھے اور منبر پر تشریف رکھتے تھے تو آپ کے سامنے اذان دی جاتی تھی پس اسی سے یہی مراد ہے۔اور جہاں تک ندائے اول کی بات ہے اس کا امیر المومنین عثمان بن عفانؓ نے اضافہ کیا تھا لوگوں کی کثرت کی وجہ سے جیسا کہ بخاری نے سائب بن یزید سے 'صحیح' میں روایت کیا ہے۔انہوں نے فرمایا کہ عہد رسول اللہ ﷺ و ابوبکرؓ اور عمرؓ میں جب امام بیٹھ جاتا تھا منبر پر تو یوم جمعہ کی نداء (اذاں) پہلی بار ہوتی تھی جب لوگوں کی کثرت ہوگئی تو حضرت عثمانؓ نے ایک اور اذاں کا اضافہ کیا جو زوراء پر دی جاتی تھی۔یعنی اس نام سے منسوب ایک مکان تھا جو کہ مدینہ میں مسجد کے قریب سب سے بلند تھا۔مکحول سے مروی ہے کہ جمعہ میں اذان یہ ہوتی تھی کہ موذن ایک مرتبہ اس وقت اذان دیتا تھا جب امام اٹھتا تھا پھر نماز قائم ہوتی تھی۔اور یہ اذان ہے جو خرید و فروخت کو حرام کر دیتی تھی۔پس عثمانؓ نے حکم دیا کہ امام کے برآمد ہونے سے پہلے منادی کی جائے تا کہ لوگ جمع ہو سکیں اور اسے غلام' عورتیں' بچے' مریض کے علاوہ آزاد مردوں کے سامنے دیا جاتا تا کہ کسی عذر کا شائبہ بھی رہ سکے۔اور حاصل کلام یہ ہے کہ ندائے ثانی وہ ہے جو کہ زوراء پر دی جاتی تھی۔اور یہ

حضرت عثمانؓ کی طرف سے تھی اور کسی صحابی رسول ﷺ نے اس وقت اسمیں کوئی نزاع نہیں کیا پس یہ سنت ہوگئی۔اس کو مسلمانوں نے اختیار کرلیا رسول اللہ ﷺ کے قول کے بموجب "علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین من بعدی"(میری سنت اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت تم پر لازم ہے) للصلوٰۃ میں لام وقت کے لئے ہے۔یعنی نماز کے وقت جیسا کہ اللہ نے فرمایا لعدتھن یعنی بوقت عدتھن اور صلوۃ سے مراد صلوۃ الجمعہ ہے۔**مِنۡ يَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ**(ترجمہ:۔جمعہ کے دن) صاحب کشاف نے کہا یہ "اذا" کا بیان وتفسیر ہے۔اور ابوالبقاء نے کہا کہ من کے یہاں معنیٰ "فی" ہیں جیسا کہ اللہ نے فرمایا۔"ارونی ماذا خلقوا من الارض"(فاطر ۴۰) اور جمعہ کو اعمش نے بالتخفیف پڑھا ہے یعنی بہ سکونِ میم اور عاصم نے میم کی حرکت کے ساتھ پڑھا ہے۔اوراسی طرح اہل حجاز نے پڑھا اور کہا ہے اصل اس میں تخفیف ہے جس نے نقل کیا اس نے میم کو حرکت دے دی ہے۔کہا جاتا ہے کہ یوم جمعہ بسکون میم عقیل کی لغۃ ہے اور جن لوگوں نے جمعہ کو میم پر زبر سے پڑھا ان کے خیال میں یہ یوم کی صفت ہے یعنی یہ لوگوں کو جمع کرنا ہے۔ جیسا کہ رجل همزه ' لمزه ضحكة کہا جاتا ہے۔پھر جمُعہ اور جَمعة۔یہ یوم العروبہ ہے اسے یہ نام اس لئے دیا گیا کہ اس میں لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اس کے جمع جمعات سے آتی ہے۔ثعلب نے گمان کیا کہ پہلا آدمی جس نے یہ نام دیا وہ کعب بن لوّی ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کے جد ہیں اور اسے العروبہ بھی کہا جاتا ہے۔سہیلی نے روض الانف میں اس طرح ذکر کیا ہے۔اور کہا العروبہ کو جمعہ کا نام صرف اسلام آنے کے بعد دیا گیا اور قریش اس دن کعبہ کے پاس جمع ہوتے تھے اور وہ ان سے خطاب کرتا تھا اور بعثت رسول اللہ ﷺ کا ذکر کرتا تھا۔اور انہیں بتلاتا تھا کہ وہ آنے والا نبی اس کی اولاد میں ہوگا انہیں رسول پر ایمان لانے پر اور ان کا اتباع کرنے کا حکم دیتا تھا۔اور شعر پڑھتا ان میں سے ایک یہ ہے

یا لیتنی شاهد فحواء دعوته — اذاقریش تبغی الحق خذ لانا

اور کہا جاتا ہے کہ اسے جمعہ اس لئے کہا گیا کہ اس دن اللہ نے خلق آدم کو جمع کیا۔اور ابن عباسؓ سے یہی مروی ہے اور بعض اقوام کا یہ قول ہے کہ اسلام میں جمعہ کا نام دیا گیا کیوں کہ لوگوں کا مسجد میں اجتماع ہوتا تھا۔ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کس چیز کی وجہ سے یوم الجمعہ کو جمعہ کا نام دیا گیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس لئے کہ اس دن تمہارے باپ آدم کا خمیر جمع کیا گیا اسی دن صور پھونکا جائے گا۔اور اسی دن بعثت ہوگی اور اس کے تیسرے پہر جس نے اس دن اللہ سے دعا مانگی اللہ اسے قبول کرتا ہے۔یہ سعید بن منصور نے مردویہ سے روایت کیا ہے ابی ہریرۃؓ سے روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہترین دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے وہ جمعہ کا دن ہے اس میں آدمؑ پیدا کئے گئے اور اسی دن جنت میں داخل کئے گئے اور اسی دن اس سے نکالے گئے اور قیامت جمعہ کے دن ہی قائم ہوگی۔روایت کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام خلائق کو پیدا کیا جمعہ کے دن اور ان کی تخلیق کو مکمل کیا۔اور یہ بھی ثابت ہے کہ ہم سے پہلی امتوں کو اسی دن کا حکم دیا گیا تھا لیکن وہ اس سے بھٹک گئیں۔یہود نے سبت (ہفتہ) کو چنا جس میں خلق نہیں واقع ہوئی اور نصاریٰ نے اتوار کو چنا جس میں خلق شروع ہوئی اور اللہ نے اس امت کے لئے یوم الجمعہ کو چنا جس میں خلق کو مکمل کیا۔

اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا کہا جاتا ہے کہ انصار نے ہجرت سے پہلے آپس میں مشورہ کیا کہ یہودیوں کا بھی ایک دن ہے جس میں ہر ساتویں دن جمع ہوتے تھے اسی طرح نصاریٰ کا بھی دن ہے جس میں وہ جمع ہوتے ہیں اور اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔تو آؤ ہم بھی اپنے لئے ایک دن مقرر کریں جس میں ہم جمع ہوا کریں اور اللہ کا ذکر کیا کریں عبادت کریں۔ان پر کچھ نے کہا کہ ہفتہ کا دن یہود کا ہے اور اتوار کا دن نصاریٰ کا ہے اپنے لئے ''عروبہ'' کو مقرر کرلو۔ وہ سعد بن زرارۃ کے پاس جمع ہوئے جس نے ان کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں۔اور انہیں وعظ و نصیحت کی پھر انہوں نے اس دن میں جمع ہونے کی وجہ سے اس کا نام ہی جمعہ رکھ لیا۔پس یہ پہلا جمعہ تھا جو اسلام میں ادا کیا گیا ہے۔البتہ وہ پہلا جمعہ جو رسول اللہ ﷺ نے ادا فرمایا وہ تھا جب آپ ؐ مدینہ ہجرت کر کے تشریف لائے تو آپ ؐ نے قبا میں عمرو بن عوف کے پاس قیام فرمایا اور وہاں پر پیر' منگل' بدھ اور جمعرات کے دن رہے اور ان کی مسجد کی بنیاد بھی رکھی پھر آپ جمعہ کے دن وہاں سے تشریف لے گئے تو راستہ ہی میں بنوسالم بن عوف کی وادی سے جب گذرے تو جمعہ کی نماز کا وقت ہو گیا تو آپ نے وہاں خطبہ ارشاد فرمایا اور نماز پڑھی۔**فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ** (ترجمہ:۔پس اللہ کے ذکر کی طرف چل پڑو) ظاہری امر سے یہ دلیل ملتی ہے کہ اللہ کے ذکر کی طرف چل پڑو۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پھر جب تم نماز کے لئے آؤ تو دوڑتے ہوئے مت آؤ بلکہ پرسکون و باوقار طریقہ سے چل کر آؤ۔پھر جتنی نماز مل جائے وہ پڑھ لو (امام کے ساتھ) اور جتنی فوت ہو جائے اس کو پوری کرلو۔صاحب اللسان نے کہا کہا جاتا ہے کہ **سعی اذ اعدا وسعی اذا مشی وسعی اذا عمل وسعی اذا قصد** یہ یعنی دوڑنے' چلنے' کرنے اور جب اس کے معنی مضی (یعنی چل پڑے) ہوتے ہیں تو ''الیٰ'' سے متعدی بناتے ہیں۔جب عمل کرنے کے معنی ہوتے ہیں تو لام سے متعدی بناتے ہیں اور اللہ کے اس قول **فاسعوا** کے معنی ہیں **قصد و مضی** (ارادہ کرنا اور چل پڑنا) اور دوڑنے کے معنی نہیں ہیں جیسا کہ اللہ کے اس قول میں ہیں **وانتم تسعون**۔ابن مسعودؓ نے فرمایا اگر یہ دوڑنے کے لئے ہوتا تو میں دوڑتا یہاں تک میری چادر گر جاتی، زجاج نے کہا **سعی** اور **ذهاب** کے معنی ایک ہیں۔پھر کہا کہ سعی کی اصل عربوں کے کلام میں ہر عمل میں تصرف ہے اور اسی سے اللہ کا فرمان ہے **وان ليس للانسان الا ماسعی**۔(النجم ۳۹) اور اس کے معنی ہیں **الا عمل** ۔پس اللہ کے اس قول **"فاسعوا الى ذكر الله"** کے معنی ہیں **امضوا الى ذكره** (اسکے ذکر کے لئے چل پڑو) قرطبی نے کہا اور یہی جمہور کا قول ہے۔اور صاحب فتح البیان نے اسے خرشتہ بن الحر سے روایت کیا انہوں نے کہا حضرت عمرؓ نے میرے پاس ایک تختی دیکھی جس پر لکھا تھا **فاسعوا الى ذكر الله** انہوں نے پوچھا یہ تمہیں کس نے املا کرائی ہے؟ میں نے کہا ابی بن کعب نے۔انہوں نے کہا ابی ہم میں سے منسوخ آیات کا سب سے زیادہ پڑھنے والا ہے۔تم اسے پڑھو **فامضؤا الى ذكر الله**. ابن منذر' ابن الانباری' ابن ابی شیبہ' ابو عبید نے فضائل میں اور سعید بن منصور نے اسے روایت کیا اور ان سب نے سوائے ابی عبید کے ابن عمر سے روایت کیا۔انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے۔اور ہم اس آیت کو جو سورۃ الجمعۃ میں ہے **فامضوا الى ذكر الله** ہی پڑھتے تھے اور انہیں سے شافعیؒ نے ''الام'' میں روایت کیا اور عبدالرزاق' فریابی' ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اور ان سب نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا کہ وہ **فامضوا الى ذكر الله** پڑھا کرتے تھے۔میں کہتا

ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ ابن حیان نے اپنی تفسیر میں کہا کہ اسی تفسیر پر ہمیں محمول کرنا چاہیئے اس حیثیت میں کہ ''سعی'' سے چلنے میں سرعت مراد نہیں لی گئی ہے۔ پس انہوں نے اس کی ''مضیٰ'' (چلنے) سے ہی تفسیر کی ہے اور جس پر مسلمانوں کا اجماع ہو جس میں اس کی مخالفت میں نہیں پڑھنا چاہیئے۔ قسم ہے کہ یہ خبریں اپنی شذوذ (نادر وغریب ہونے) کی وجہ سے اصحاب رسول ﷺ کے نزدیک جو حضرت عثمان بن عفانؓ کے عہد میں تھے ترتیب قرآن کے وقت مقبول نہ ہو سکیں۔ اور ہم جانتے ہیں انہوں نے ان کی غرابت کی وجہ سے رد کر دیا۔ یا انہوں نے اسے ارشاد باری تعالیٰ کی تفسیر پر روایت کو محمول کیا اگر ایسا نہ ہوتا تو کیونکر اجماع کرتے کہ فاسعوا الله کا کلام ہے پس اس کلمہ کو مصاحف میں لکھتے اسی لئے قراء سبعۃ اور قراء عشرہ نے اپنی قراءت میں اس کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی قراءت شاذہ کے قاریوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اسی وجہ سے ائمہ قراءت نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مثلاً امام دانی اور امام شاطبی وغیرھم بلکہ اسے تو صاحب اتحاف نے بھی ذکر نہیں کیا۔ جس نے قراءت شاذہ میں ایک کتاب بھی املا کرائی ہے۔ اس لئے اس قسم کی روایت کے مردود ہونے میں کوئی شک ہی نہیں ہے۔ اور صاحب الغیث نے کہا ہے کہ اس سورۃ کے متن میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مفسرین نے کہا الصلوٰۃ سے مراد صلوٰۃ الجمعۃ ہے اور ذکر اللہ سے مراد خطبہ ہے۔ اس نماز کی فرضیت کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ امام سرخسی نے المبسوط میں کہا کہ جہاں تک الکتاب کا تعلق ہے تو اس میں اللہ کا یہ ارشاد ہے۔ یاایھا الذین اٰمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر الله ۔ اور آیت میں ذکر الله سے مراد بالاتفاق مفسرین ''الخطبۃ'' ہے۔ اور یہ حکم وجوب کے لئے ہے۔ جب ''السعی الی الخطبۃ کو فرض کیا گیا جو کہ جواز صلوۃ کی شرط ہے صلوٰۃ کی طرف سعی کرنا بطریق اولیٰ فرض ہوگا۔ جہاں تک سنت کا تعلق ہے اس کے لئے حدیث جابرؓ ہے۔ آپ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطاب فرمایا اور کہا اے لوگو اعمال صالحہ کے ساتھ اپنے رب کی طرف رخ کرلو یہ مشغولیات سے پہلے' اور اللہ کی طرف صدقہ کے ذریعہ محبوب بنو اور لوگوں کو کھلاؤ اور ان کی مدد کرو اور ان کی ضروریات پوری کرو اور جان لو کہ اللہ نے تم پر جمعہ فرض کیا اس دن اس شہر میں اور اس جگہ میں۔ اور جہاں تک اجماع کا تعلق ہے پس امت اس کی فرضیت پر رسول اللہ ﷺ کے دور سے آج کے دن تک مجتمع ہے لیکن ان کا اختلاف محض جمعہ کے دن میں اصل فرض کے بارے میں ہے۔ شافعیؒ اپنے جدید قول میں اور زفر و مالک واحمد ومحمد ایک روایت میں فرماتے ہیں کہ جمعہ کا وقت فرض کیا گیا ہے اور ظہر کو اس سے بدل دیا گیا۔ ابوحنیفہ' ابو یوسف اور شافعی اپنے قدیم قول میں فرماتے ہیں کہ فرض ظہر ہی ہے جبکہ پہلا قول ہی فقہاء کے نزدیک سب سے زیادہ صحیح قول ہے۔ اور جہاں تک قیاس کا تعلق ہے ہمیں جمعہ کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے اور اس دن ظہر کو ترک کر دیا گیا جبکہ ظہر فرض ہے اور کسی فرض کا ترک جائز نہیں ہوتا۔ مگر ایسے فرض کی وجہ سے جو کہ اس پہلے والے فرض سے زیادہ موکد اور اولیٰ ہو تو یہ ساری بحث علامہ عینی نے شرح ہدایہ میں ذکر کیا ہے۔ پھر مجتہدین نے اس کی شروط کے بارے میں اختلاف کیا۔ امام حکیم ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں کہا ہے کہ مسجد جمعۃ کی شرط ہے امام مالکؒ کے نزدیک کیونکہ مسجد ہی اس نماز کے لئے سب سے زیادہ مناسب جگہ ہے۔ وہ شہر اور سلطان کی کوئی شرط نہیں لگاتے کیونکہ یہ احوال نماز کے لئے غیر مناسب ہے اسی طرح امام شافعیؒ نے کہا کہ وہ شہر کی کوئی شرط نہیں

لگاتے بلکہ اسے ہر جگہ جائز سمجھتے ہیں۔ جہاں چالیس آزاد مرد (رجل) ہوں اور وہاں سے ادھر اُدھر سردی گرمی میں نہ جاتے ہوں اور یہی بات امام احمدؒ نے بھی فرمائی ہے۔ البتہ مالکؒ نے کہا چالیس سے کم نمازیوں سے بھی جمعہ قائم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک بادشاہ کا تعلق ہے شافعیؒ کے نزدیک صحت جمعہ کی شرط نہیں ہے۔ لیکن سنت یہ ہے کہ یہ سلطان کی اجازت سے قائم ہوتی ہے۔ اور یہی احمدؒ نے کہا شاید یہ فتنہ اور خصومت کو دفع کرنے کے لئے ہے جیسا کہ مذہب حنفیہ بھی ہے' پس سلطان کا وجود شرط مستقل نہیں ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ شہر وسلطان مالکؒ وشافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک صلوٰۃ الجمعۃ کی شرط نہیں ہے۔ سوائے مسجد کے یہ شرط ہے مالکؒ کے نزدیک اور چالیس آزاد مقیمین کی شرط شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک ہے۔ محدثین نے اس میں کوئی شرط نہیں رکھی ان کی کتاب اللہ پر نظر تھی۔ یہاں تک کہ صاحب فتح البیان نے فرمایا ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں ایک حرف بھی ایسا نہیں پایا جاتا جو مذکورہ تمام امور میں کسی پر بھی دلالت کرتا ہو۔ مثلاً جامع مصر (شہر کی بڑی مسجد) کا ہونا' امام اعظم کا ہونا اور اسی طرح صحت جمعہ اور اس کے فرائض میں سے کسی فرض یا ارکان میں سے کسی رکن کی شرطیں' صاحب فتح البیان کے مذکورہ بیان پر علامہ ابن الہمام کی ہدایہ کی شرح' فتح القدیر میں یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے کہ کتاب اللہ سے اس کی فرضیت کی دلیل تمام جگہوں میں عموم کا فائدہ دیتی ہے۔ پس مخصوص مقامات میں اس کی نفی بغیر کسی سنی سنائی دلیل کے قیاس کے خلاف ہے۔ جہاں تک حنفی لوگوں کی آراء کا تعلق ہے وہ کہتے ہیں کہ جمعہ کے لوازم کی ۱۲ شرائط ہیں چھ نمازی کے بارے میں ہیں کہ وہ آزاد ہو' مرد ہو' مقیم ہو' صحیح (صحت مند) ہو دونوں پاؤں اس کے سلامت ہوں اور بینائی بھی لیکن اندھے کو جب کوئی قائد مل جائے تو اس پر بھی جمعہ واجب ہو جائے گا۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ حریہ اور اقامت کی شرائط میں اختلاف ہے۔ جیسا کہ قاضی ابن رشد نے ''بدایۃ المجتہد'' میں کہا البتہ یہ کس پر واجب ہوگا تو جس میں بھی مذکورہ بالا نماز کے وجوب کی شرطیں پائی جائیں گی۔ اور ان کے علاوہ دیگر چار شرطیں ہیں جن میں سے دو پر اتفاق ہے۔ متفق علیہ میں ذکورہ اور صحت ہے اس وجہ سے جمعہ عورت پر واجب نہیں ہے اور نہ ہی مریض پر لیکن اگر مسجد میں آجائیں تو اہل جمعہ میں سے ہوں گے۔ اور جہاں تک مختلف فیہ شروط کا تعلق ہے تو وہ مسافر اور العبد (غلام) ہیں' جمہور کا رجحان یہ ہے کہ ان پر جمعہ واجب نہیں۔ لیکن داؤد اور ان کے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ ان دونوں پر جمعہ واجب ہے۔ اور ان کے اختلاف کا سبب دراصل اس بارے میں وارد حدیث کی صحت میں اختلاف ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ہے کہ **الجمعة حق واجب على كل مسلم فى جماعة الا اربعة** عبد مملوک' یا عورت یا مریض یا بچہ اور ایک دوسری روایت میں **الاخمسة** کے الفاظ ہیں اور اس میں مسافر شامل ہے۔ اور یہ حدیث اکثر علماء کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ العینی نے کہا نخعی اور زہری سے منقول ہے کہ مسافر پر وجوب جمعہ ظاہریہ کا قول ہے۔ اور اکثر اہل علم نے کہا کہ اندھے پر جمعہ واجب نہیں سوائے اس کے کہ اسے قائد میسر ہو ورنہ نہیں۔ اس طرح سے اپاہج شخص اور وضو عاجز سے شخص پر اور مددگار کے محتاج پر۔ العینی نے یہ بھی کہا کہ ان دونوں کے نزدیک ان پر قائد اور مساعد کے وجود کے ساتھ واجب ہے اور یہی امام شافعیؒ نے کہا ہے۔ مرغینانی نے کہا وہ غلام جس کو اس کے مالک نے جمعہ کی اجازت دے دی ہو اسے اختیار ہے اور '' **منية المصلى** '' میں ہے کہ صحت جمعہ کے لئے شرط کا پایا جانا ضروری ہے اور اس

کی بحث آگے آئے گی جہاں تک سنت کا تعلق ہے جو نمازی کے علاوہ ہیں وہ ہیں المصر الجامع یعنی (بڑا شہر) اور سلطان اور جماعت اور خطبہ اور وقت اور اظہار۔ جہاں تک پہلی شرط کا تعلق ہے تو صاحب الھدایہ نے کہا جمعہ صحیح نہیں ہوتا مگر مصر جامع یا شہر کی مسجد میں اور دیہات میں رسول اللہ ﷺ کے قول کے مطابق جائز نہیں۔ جو اسطرح ہے **لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا اضحى الا فى مصر جامع.** العینی نے کہا کہ زیلعی نے کہا ہے کہ یہ حدیث مرفوع غریب ہے۔ اور ہم نے موقوف پایا ہے حضرت علیؓ سے عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں روایت کیا ہمیں معمر نے ابی اسحاق عن حارث عن علیؓ سے خبر دی کہ **لا جمعه ولا تشريق ولا صلوة فطر ولا اضحى الا فى مصر جامع او مدينة**۔ اور عبدالرزاق نے بھی روایت کیا ہے اور بیہقی نے المعرفۃ میں سعید سے اور انہوں نے زید سے روایت کیا اور کہا کہ اسی طرح اس کو الثوری نے زبید یہ سے روایت کیا اور اسے حضرت علیؓ سے موقوفاً روایت کیا گیا ہے۔ جہاں تک نبی ﷺ کا تعلق ہے ان سے کوئی روایت نہیں ملتی۔ ابن حزم نے ''محلی'' میں کہا ہے کہ یہ قول علیؓ وحذیفہؓ سے ہے کہ گاؤں والوں پر جمعہ نہیں ہوتا جمعہ تو شہر والوں پر ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اکثرین اسی موقف کے حامی ہیں کہ یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ حضرت علیؓ پر موقوف ہے۔ العینی نے کہا کہ ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ یہ مسند مرفوع ہے۔ ابو یوسفؒ امام الحدیث ہیں تو ان کا قول حجت ہے۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ عینی کے قول کی بنیاد یہ ہے کہ امام خواہر زادہ نے اپنی مبسوط میں ذکر کیا ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے اس بات کو اپنی املاء میں نبی ﷺ سے بطور مسند مرفوع ذکر کیا ہے۔ اور اس باب میں کوئی لمبی چوڑی بحث نہیں ہے کیونکہ انہوں نے اس حدیث کے مرفوع متصل ہونے کے طُرق کا ذکر نہیں کیا۔ باوجودیکہ بہت سارے محدث اس روایت کے مرفوع ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ اس وجہ سے لازم تھا کہ وہ اس قول کے مرفوع ہونے کے طرق بھی بیان کرتے تاکہ یہ حضرت علیؓ کا قول قرار دینے والوں کا رد کیا جاسکتا تھا مگر اس کا مسند و مرفوع ہونا امر ثابت ہے تو وہ بغیر دلیل کے ثابت نہیں ہوتا اور دلیل یہاں نامعلوم ہے کیونکہ جس صحابی نے اس قول کو نبیؐ کی طرف مرفوع کیا ہے وہ تو ائمہ حدیث کے نزدیک غیر معروف ہے۔ پس اس کے ذریعہ استدلال کرنے والے پر واجب ہے کہ سب سے پہلے اس قول کو جانچے پھر اس سے استدلال کرے اور اسی وجہ سے علامہ عینی نے اس کے نبیؐ تک مرفوع ہونے سے بحث نہیں کی ہے۔ حالانکہ متن حدیث اور راویان حدیث کے احوال کے متعلق بڑے باخبر اور ناقد تھے اس لئے وہ اس کے مرفوع ہونے کی بحث میں پڑے ہی نہیں۔ بلکہ اس میں بحث سے گریز کیا اور صرف یہ کہا بالفرض اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ موقوف ہے اور صحیح ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس حدیث کے موقوف عن علیؓ ہونے میں کوئی شک نہیں تو جائز نہیں ہے کہ آیت جمعہ کو خاص کریں اس موقوف پر جیسا کہ مذہب حنفیہ ہے۔ پھر میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ اللہ کا ارشاد **للصلوٰة من يوم الجمعة** پانچوں نمازوں کی طرح ادائیگی کے حق کا اجمالی بیان ہے۔ پس اسے اس کی مراد پر موقوف نہیں کیا جاسکتا مگر شارع الاسلام کی طرف سے بیان کے ذریعہ۔ پس جس طرح شارع اسلام کی طرف سے تمام نمازوں کے اوقات ان کی تعداد رکعت اور ان سے ملحق احوال مثلاً قیام، رکوع، سجود اور جلسہ وغیرہ کا بیان آیا ہے یہاں تک اجمالی چیزوں کی مکمل تفسیر ہوگئی جیسے کہ جمہور اہل اصول کی رائے ہے اسی طرح شارع اسلام ہی کی طرف سے جمعہ کی نماز کے بارے میں

یہ بھی آیا ہے کہ اس کی دو رکعتیں ہیں اور ان کے ادا کرنے کا کیا وقت ہے اس کی ادائیگی کا وقت سورج کے زوال کے بعد ہے۔ پس یہ مجمل شارع کے بیان کی بدولت مفسر (واضح) ہوگیا۔ پس شارع نے جس طرح اسے ادا کیا تھا اس کا ادا کرنا ممکن ہوگیا اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ مفسر کے ساتھ تاویل کا احتمال باقی نہیں رہتا تو نماز جمعہ دیگر نمازوں کی طرح شارع کی طرف سے مفسر ہوگئی' اسے کسی قسم کی شرائط کے ساتھ مشروط رکھنا جائز نہیں ہوگا بلکہ شارع کے بیان اور ان کے طریقہ ادائیگی کے مطابق اسے ادا کرنا واجب ہوگا پس اس میں مصر جامع وغیرہ کی شرط خبر واحد کے ذریعہ رکھنا جائز نہیں ہوگا چہ جائیکہ خبر موقوف کے ذریعہ اس میں اس قسم کی شرطیں رکھی جائیں۔ اور یہ بھی ہے کہ اللہ نے اس نماز کو کسی بھی چیز سے غیر مقید فرمایا ہے بلکہ "اذا نودی للصلوٰة من یوم الجمعة فاسعوا الی ذکر الله' فرمایا اور اس کا اجمال شارعؑ کے بیان سے زائل ہو چکا ہے۔ پس صرف مطلقاً صلوۃ الجمعہ ہی رہ گئی ہے یعنی کسی بھی قید سے غیر مقید اور کسی بھی شرط سے غیر مشروط۔ اہل اصول نے فرمایا ہے کہ کتاب اللہ میں سے کسی مطلق فرمان پر اس کے اطلاق کے باوجود عمل کرنا ممکن ہے تو اس میں قیاس اور خبر واحد کے ذریعہ اضافہ کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اسے مقید کرنا اس کے وصف مطلق کو منسوخ کرنے کے قائم مقام ہے۔ اور کتاب اللہ قطعی ہے۔ اسے ایسا ہی ہونا چاہئے۔ جبکہ یہ دونوں (خبر واحد اور قیاس) ظنی ہیں اس لئے ظنی بات کے ذریعہ کسی قطعی بات کو منسوخ کرنا جائز نہیں ہوتا لہٰذا جمعہ کی نماز کو جب شارعؑ کے ادا کردہ طریقہ کے مطابق ادا کرنا ممکن ہو تو قیاس اور خبر واحد کے ذریعہ اس پر اضافہ کرنا جائز نہ ہوگا۔ پس اسے مصر جامع (بڑے شہر) سے مشروط کرنا جائز نہ ہوگا اور اس نماز کی صحت کسی شرط پر موقوف نہیں ہوگی۔ پس تمام شہروں اور دیہاتوں میں صلوٰۃ الجمعہ ہونا جائز ہے۔ جیسے کہ محدثین امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمدؒ نے کہا ہے۔ جہاں تک دوسری شرط کا تعلق ہے تو صاحب الھدایہ کا کہنا ہے کہ اس کی اقامت جائز نہیں مگر سلطان کے لئے یا جسے سلطان نے حکم دیا ہو۔ اس لئے کہ نماز جمعہ مجمع عظیم کے ذریعہ قائم ہوتی ہے اور آگے ہونے یا آگے کرنے میں تنازعہ ہوسکتا ہے اور سلطان اور سلطان کے نائب کی غیر موجودگی میں ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اس حکم کے رفع نزاع کے لئے دونوں میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے۔ شافعیؒ کے نزدیک صحت جمعہ کے لئے سلطان کی کوئی شرط نہیں ہے لیکن ان کے نزدیک ایک سنت ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا۔ اور مالکؒ ایسا نہیں سمجھتے اور اس بارے میں اس بات سے دلیل لی ہے کہ حضرت عثمانؓ جب مدینہ میں محصور تھے حضرت علیؓ نے لوگوں کے ساتھ نماز جمعہ پڑھی تھی اور یہ کہیں مروی نہیں ہے کہ اس نماز کے لئے انہوں نے عثمانؓ سے اجازت لی تھی۔ حکمرانی تو ان ہی کے ہاتھ تھی لیکن وہ اس کی تنفیذ کی قدرت نہیں رکھتے تھے کیونکہ وہ محصور تھے اور لوگوں نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔ اصحاب رسولؐ نے کچھ نہیں کہا تھا بلکہ حضرت علیؓ کے ساتھ نماز پڑھی تھی۔ پس جبکہ اس طرح ہوا تھا تو سلطان کے ہونے کی شرط اسکی اقامت کے لئے کیسے ہوسکتی ہے۔ اور تمام نمازوں کی طرح جمعہ کی اقامت کے لئے سلطان کی شرط نہیں ہوسکتی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ فعل ان کی مرضی سے کیا تھا محض وہم ہے۔ کیونکہ متردد و مشکوک چیز کا شرط ہونا جائز نہیں ایسے امر قطعی کے لئے جو کتاب اللہ سے ثابت ہو چکا ہے اور وہ صلواۃ الجمعۃ ہے۔ اصل میں حنفی حضرات نے سلطان کی شرط مقدم ہونے کے تنازعہ کو دور کرنے کے لئے رکھی تھی اور صحت نماز کے لئے اسے شرط نہیں بنایا تھا۔ اور اگر ایسا ہی تھا تو عینی کبھی بھی نہ کہتے

کہ ہمارے نزدیک جب امام تک رسائی نہ ہو تو لوگوں کو چاہئے کہ وہ جمع ہوں اور نماز پڑھانے والے کو آگے کر دیں۔ اسی طرح ابو نصر بغدادی نے ذکر کیا ہے اور کہا اجناس میں ابن سماعۃ کی نوادر سے یہ روایت منقول ہے کہ امام محمدؒ سے مروی ہے کہ اگر کوئی غلبہ حاصل کرنے والا شہر پر غالب آ جائے اور وہ انہیں جمعہ کی نماز پڑھائے تو وہ جائز ہوگی۔ اسی طرح جب تمام لوگ کسی ایک شخص پر جمعہ کی نماز پڑھانے کے لئے اتفاق کر لیں تو یہ حنفیہ کے نزدیک جائز ہے پس جب نماز جمعہ اس طور پر صحیح ہو جائے بغیر اقامہ سلطان اور اس کے اجازت کے بغیر تو معلوم ہوا کہ اس کی اقامت کے لئے سلطان کے وجود کی حقیقتاً کوئی شرط نہیں۔ تیسری شرط وقت ہے حنفیہ کے نزدیک اس کا وقت' وقت ظہر ہے اس کے علاوہ جمعہ کی نماز درست نہیں اور یہ جمہور کا قول ہے اور احمد بن حنبلؒ اس خیال کے حامی ہیں کہ جمعہ کی نماز زوال سے پہلے پڑھنا جائز ہے۔ غالباً انہیں یہ تعجیل حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت سے سمجھ میں آئی ہے۔ جس میں انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ہم دوپہر کا کھانا اور قیلولہ (دوپہر کا سونا) نماز جمعہ کے بعد ہی کرتے تھے تو انہوں نے اس نماز کو زوال سے قبل جائز سمجھا۔ جہاں تک جمہور کا تعلق ہے تو اس روایت سے محض تبکر یعنی سویرے پڑھنا سمجھتے ہیں۔ انہوں نے زوال سے قبل ادا کرنے کی اجازت نہیں دی اور ان تمام مسائل کی وضاحت پیچھے کر چکے ہیں۔ چوتھی شرط خطبہ ہے نماز جمعہ کے لئے۔ اور عطاء' قتادہ' ثوری' مالک' شافعی اور ابوثور کا یہی مذہب ہے اور ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا خطبہ کی وجہ سے نماز میں قصر کر دیا گیا اور حضرت عائشہؓ سے بھی یہی مروی ہے۔ سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ جمعہ کی چار (رکعت) تھیں پھر خطبہ اس میں شامل کیا گیا پس دو رکعات رہ گئیں خطبہ کی وجہ سے۔ میں کہتا ہوں کہ صحیح بات یہی ہے کہ خطبہ کو دو رکعات کا عوض بنا دیا پس یہ سوائے فرض کے کچھ نہیں۔ لیکن بعض فقہاء نے کہا کہ جمعہ خطبہ کے بغیر بھی جائز ہے اور یہ قول حسن بصری کا ہے۔ اور مالکؒ نے کہا یہ شرط نہیں ہے۔ اور جمہور مالکیوں کے خیال میں یہ فرض ہے سوائے ابن ماجشون کے اور اکثر کا رجحان یہی ہے کہ یہ شرط اور رکن ہے مگر فرض نہیں ہے اور حنفیہ لوگوں نے کہا یہ فقط شرط ہے اور اسکی فرضیت کا ذکر نہیں کیا۔ اور کہا کہ نبیؐ نے ساری زندگی خطبہ کے بغیر جمعہ نہیں پڑھا۔ زہری سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم تک یہ پہونچا ہے کہ آپؐ نے فرمایا **لا جمعة الا بخطبة** (خطبہ کے بغیر جمعہ نہیں) اور یہ خطبہ کی شرط ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ البتہ خطبہ کے طویل اور مختصر ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ حسن سے مروی ہے کہ ابو حنیفہؒ خطبہ خفیف دیا کرتے تھے اللہ کی حمد و ثناء بیان کرتے تھے اس کی توحید کی شہادت دیتے تھے' رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجتے تھے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے کوئی سورة پڑھتے تھے۔ اور مالک نے کہا کہ **الخطبه كل كلام ذى بال**۔ خطبہ ہر بااثر کلام کا نام ہے اور ان کے اصحاب میں سے ابن قاسم نے کہا کہ خطبہ ہر اس کلام کو کہتے ہیں جس پر کلام عرب کے مطابق خطبہ کا نام دیا جا سکے جو کہ اللہ کی حمد و ثناء سے شروع کیا گیا ہو۔ ابو یوسفؒ اور محمدؒ نے کہا اسے لازماً ذکر طویل ہونا چاہئے کیونکہ تسبیح و تحمید کو خطبہ نہیں کہتے۔ حنفی علماء نے کہا کہ طہارت سنت ہے یہاں تک کہ غیر طہارت پر خطبہ دینا جائز ہے۔ حصول مقصود کے لئے اور وہ ذکر و وعظ ہے اور خطبہ صلوٰۃ کی طرح نہیں ہے اور نہ ہی نماز کے کسی حصہ کی طرح ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ خطبہ غیر قبلہ رخ پر دیا جاتا ہے۔ اور اس سے کلام فاسد نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ جب خطبہ عبادتِ واجبہ بالا جماع

ہے جیسا کہ العینی نے ذکر کیا ہے تو اسے صرف طہارت کے ساتھ ہی ادا کیا جائے۔ اور وہ پانچویں شرط جماعت ہے۔ اس لئے کہ جمعہ کا لفظ اسی سے مشتق ہے۔ جماعت کی مقدار ابوحنیفہؒ کے نزدیک امام کے سوا تین نمازی ہیں اور ابو یوسفؒ امام محمدؒ کا کہنا ہے کہ امام کے سوا دو کا ہونا ضروری ہے۔ صاحب الھدایہ نے کہا ہے کہ سب سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ صرف ابو یوسفؒ کا قول ہے۔ ان کے نزدیک دو میں بھی اجتماع کے معنی ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک صحیح اجتماع تین کا ہوتا ہے۔ اور مالکؒ نے کہا جمعہ تین اور چار سے جائز نہیں ہوتا۔ شافعیؒ نے کہا یہ جائز نہیں ہوتا مگر جب چالیس مرد جمع ہوں اور ایک گروہ نے کہا کہ تیس مرد ہوں اور ان میں سے کچھ عدد کی شرط نہیں رکھتے اور کچھ کہتے ہیں امام کے علاوہ ایک آدمی، اور وہ کہنے والے طبری ہیں۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ جمع کے معنی میں اختلاف کی بناء پر یہ اختلاف ہے۔ حنفیوں کے نزدیک مسلّم شرائط کا یہ تفصیلی بیان تھا۔ اس بیان سے آپ ان شرائط کے بارے میں ائمہ حضرات کا اختلاف بھی جان گئے اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ شرائط اس معنی میں شرائط نہیں ہیں کہ اگر وہ نہ پائی جائیں تو نماز ہی نہ ہوں گی۔ کیونکہ جمعہ کی نماز ان شرائط کے نہ پائے جانے کے باوجود بھی ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ صاحب ہدایہ نے کہا ہے **فان حضروا (ای المسافرالاعمیٰ وغیرهما.) فصلوامع الناس اجزاهم عن فرض الوقت لانهم تحملوه ای الحرج فصارو اکالمسافر اذاصام ا نتهی** ۔ اگر وہ آجائیں (یعنی مسافر و نابینا وغیرہ) اور انہوں نے لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ لی تو ان کے لئے وقت کے فرض کی ادائیگی کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس ذمہ داری کو پورا کر لیا۔ پس وہ اس مسافر کی طرح ہو جائیں گے جس نے روزہ رکھا ہو۔ عینی نے کہا ہے کہ انہیں جمعہ ظہر کے بدلے کافی ہو جائے گا۔ اور ابن قدامہ نے کہا ہے کہ ہم اس کے خلاف کو نہیں جانتے۔ اور ابن منذر نے کہا ہے کہ اہل علم متفق ہیں کہ عورتیں اگر جمعہ پڑھ لیں ان کے لئے کافی ہوگا۔ حالانکہ سب کا اجماع ہے کہ عورتوں پر جمعہ نہیں۔ حاصل کلام یہ کہ حنفیوں نے ان امور کو جمعہ کی نماز کے لئے حقیقی شرائط قرار نہیں دیا۔ بلکہ انہوں نے ان امور کو مسلمانوں کا تذبذب دور کرنے کے لئے ذکر کیا ہے پس لوگوں کے لئے آسانی اور سہولت ہوگئی۔ اس لئے قاضی ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں کہا ہے یہ تمام باتیں اس بارے میں ذہنی شدت پسندی ہے ٔ اللہ کا دین آسان ہے اس نے یہ بھی کہا ہے کہ کہنے والا کہہ سکتا ہے اگر یہ باتیں صحت نماز کے لئے شرط تھیں تو نبیؐ کا ان کے تعلق سے خاموش رہنا ان کا بیان نہ کرنا جائز نہ ہوتا کیونکہ اللہ کا فرمان ہے.
لتبيّن للناس ما نزّل اليهم(**النحل** ۴۴) اور دوسری جگہ پر ہے **ولتبين الذى اختلفوا فيه**(**النحل** ۶۴) اس سے ظاہر ہوا کہ شارعؑ نے جمعہ کی نماز کے لئے کوئی شرط بیان نہیں کی۔ البتہ ائمہ مجتہدین ان امور کو محض لوگوں کی آسانی کے لئے شرط قرار دیا ہے۔ پس جس کسی نے جمعہ کی نماز ان شرائط کے بغیر بھی ادا کی تو وہ درست ہوگی اور وہ نماز فرض ہی کے طور پر ادا ہوگی۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ حج زاد و راحلہ سے مشروط ہے تو جس نے اس کے بغیر بھی بیت اللہ کا حج کر لیا جیسا کہ اکثر اولیاء وصالحین کرتے رہے ہیں تو ان کی طرف سے بطور فرض ہی واقع ہوگا۔ باوجود یکہ یہ دونوں چیزیں کتاب اللہ میں بطور شرط ہی بیان کی گئیں ہیں۔ **وَذَرُوا الْبَيْعَ** ۔
(ترجمہ:۔ اور خرید و فروخت چھوڑ دو) اللہ نے شواغل دنیا میں سے (اللہ کے) ذکر سے غافل کرنے والی ہر شئے کو ترک کرنے کا حکم دیا

ہے۔ جیسے کہ خرید وفروخت وتجارت یالین دین اور اس دوران بیع (خرید وفروخت) کو خاص طور پر اس لئے منع کیا کہ جمعہ کے دن مدینہ میں اطراف سے مال ومتاع لاتے تھے اور جب سورج نصف النہار پر پہونچتا تھا اور وقت ظہر قریب ہوتا تھا تو تجارت میں گرمی آجاتی تھی اور خرید وفروخت ولین دین میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ اور بازار ساز وسامان سے بھر جاتے تھے۔ اور لوگ ان کی طرف لپکتے تھے اور یہ وقت امور دنیا میں اس کی رغبتوں میں مصروف ہوجانے کا وقت ہوتا تھا۔ پس اللہ نے بیع (تجارت وخرید وفروخت) کو چھوڑ دینے کا حکم دیا اس لئے کہ اس میں کم فائدہ ہے اور جمعہ کی طرف سبقت لے جانے کی تنبیہ کی کہ اس میں زبردست بھلائی اور عظیم فائدہ ہے۔ طحاوی نے کہا یہ آیت جمعہ کی طرف ''سعی'' کی وجوب پر اور ''بیع وشراء'' (تجارت ولین دین) کی حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ اذاں کے وقت بیع وشراء کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے۔ اکثر علماء کا رجحان یہ ہے کہ جس نے خریداری کی اور مال فروخت کیا اذاں سننے کے بعد تو ان کی بیع وشراء فاسخ نہیں ہوگی بعض نے کہا کہ یہ فاسخ ہوجائے گی اور ان کے اختلاف کا سبب یہ ہے کہ دراصل وہ لوگ اس بات میں مختلف ہیں کہ ایسی چیز سے منع کرنا جس چیز کی اصل مباح ہو۔ اگر وہ نہی کسی صیغہ سے مقید ہو تو منہی عنہ کے فساد سے وہ حلال ہوجائے گی یا نہیں۔ پس جس نے یہ کہا اصل مباح والی چیز میں خارجی امر اثر نہیں کرتا اس کا یہ کہنا ہے کہ مباح اپنی اصلی اباحتہ پر باقی رہتا ہے۔ اس نے بیع وشراء کو جائز قرار دیا ہے۔ اور جس نے یہ کہا ہے کہ نہی کی صفت اس پر موثر ہوتی ہے اس نے اس بیع وشراء کو ناجائز قرار دیا اور کہا کہ ان کے فساد سے بیع وشراء ان کے نزدیک **یوم النحر** (قربانی) کے روز کی طرح ہوجائے گی۔ اور پہلا قول ابوحنیفہؒ ابویوسفؒ امام محمدؒ زفر اور امام شافعیؒ کا ہے وہ بیع وشراء کو کراہت کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں اور یہی قول جمہور ہے۔ اور دوسرا قول مالک، احمد اور ظاہری کا ہے اور اسی طرف ابن عباسؓ کا رجحان ہے اور مسروق سے مروی ہے کہ زوال شمس کے ساتھ بیع حرام ہوجاتی ہے اور اسی طرح ضحاک اور مسلم بن یسار سے روایت کی گئی ہے۔ **ذَالِكُمْ** (ترجمہ:۔ یہ) یعنی تمہارا بیع کو چھوڑ دینا۔ **خَيْرٌ لَّكُمْ** (ترجمہ: تمہارے لئے بہتر ہے) دنیا اور آخرۃ میں۔ **اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** (ترجمہ:۔ اگر تم جان لو) یعنی صلوٰۃ الجمعہ کے لئے ''سعی'' اور بیع وشراء ترک کرنے کا ثواب۔

(۱۰) **فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ** (ترجمہ: جب نماز پوری ہوجائے) یعنی صلوۃ جمعہ **فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ** (ترجمہ: تو زمین میں پھیل جاؤ) ان ضرورتوں کے لئے جو تم سے لاحق ہیں اور یہ حکم وجوب کے لئے نہیں ہے۔ اس لئے کہ جمعہ کے نمازی کے لئے واجب ہے کہ نماز کے بعد مسجد میں بیٹھا رہے۔ **وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ** (ترجمہ:۔ اور خداداد روزی اللہ کا فضل تلاش کرو) جسکے ہاتھ میں خیر کی کنجیاں ہیں۔ **وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا** (ترجمہ:۔ اور اللہ کا ذکر بہت کرو) ہر آن وہر زمان **لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ** (ترجمہ:۔ تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ) اور اللہ کی جنتوں میں داخل ہوجاؤ۔

(۱۱) **وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا** (اور جب انہوں نے تجارت اور کھیل تماشہ ہوتے دیکھا تو اس کی طرف تیزی سے لپکے) جمہور نے کہا **اليها** میں ضمیر تجارت کی طرف رجوع کرتی ہے اور ابن ابی عبلۃ نے اسے **اليه** پڑھا ہے اور وہ ضمیر کو ''لھو'' کی طرف لوٹاتے ہیں اور دونوں جائز ہیں اخفش نے کلام عرب سے ان دونوں کو جائز قرار دیا۔ حسن نے کہا کہ اہل مدینہ

بھوک (قحط) اور گرانی میں مبتلا تھے۔ رسول اللہ ﷺ خطبۂ جمعہ دے رہے تھے اس دوران ایک قافلہ آیا لوگوں نے اسے سنا اور پھر چلے گئے اور رسول کھڑے ہوئے تھے۔ عبداللہ بن جابرؓ سے مروی ہے کہ بارہ افراد کے علاوہ سب چلے گئے تو آیت جمعہ نازل ہوئی۔ ابوبکر غالب بن عطیہ نے کہا کہ دس افراد موجود رہ گئے جن کے لئے جنت کی بشارت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ گیارہ افراد تھے۔ گیارہ میں عمارؓ تھے اور کہا جاتا ہے کہ ابن مسعودؓ تھے قتادہؓ کی روایت ہے کہا جمعہ کے دن رسول اللہ ﷺ لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے لوگوں میں کچھ کھسکنا شروع ہوئے اور ان میں سے ایک نفری باقی رہ گئی کسی نے کہا تم کتنے تھے تو انہوں نے اپنے آپ کو گنا' وہ ایک عورت سمیت تیرہ افراد تھے۔ آپ ﷺ دوسرے خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے اور لوگوں کو خطبہ دینے لگے۔ ابوسفیان نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ اس کی حدیث میں یہ بھی الفاظ ہیں کہ آپ انہیں وعظ و نصیحت کررہے تھے۔ تو وہ کھڑے ہونا اور کھسکنا شروع ہوئے یہاں تک ایک مختصر سی نفری باقی رہ گئی آپ نے پوچھا تم کتنے تھے انہوں نے خود کو گنا اور ۱۲' افراد اور ایک عورت تھی آپ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم میں سے تمہارا آخری آدمی تم میں سے پہلے کی پیروی کرتا تو تم پر وادی آگ سے بھر جاتی'' پس اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ **واذا راؤ تجارة او لهوا انفضوا اليها وتركوك قائما**'' اور جہاں تک **اللهو** کا تعلق ہے حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے انہوں نے کہا جب بچیوں کا نکاح وغیرہ ہوتا تو ڈھول اور مزامیر بجاتے ہوئے نکلتے تھے اور لوگ رسول اللہ ﷺ کو منبر پر کھڑا چھوڑ دیتے تھے اور اس کی جانب متفرق ہو کر رجوع کرتے تھے۔ پس اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ مجاہد نے کہا اللھو یعنی ڈھول او رگناہ اور **انفضوا** کے معنی ہیں تفرقوا اور اس کا اسم **انفقض** یہ اور **تفضض الشئی** بمعنی تفرق اور اسی سے شاعر کا یہ شعر ہے۔

اجتمعوا اذا فضضنا حجر يتهم ونجمعهم اذا كانوا يدادا

وَتَرَكُوكَ قَآئِمًا (ترجمہ:۔ اور تم کو کھڑا چھوڑ دیا) خطبہ دیتے ہوئے اور ان نمازیوں میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا سوائے ایک مختصر جماعت کے۔ **قُلْ** (ترجمہ:۔ کہہ دو) ان متفرق ہونے والوں کو۔ **مَا عِندَ اللّٰهِ** (ترجمہ:۔ جو کچھ اللہ کے پاس ہے) یعنی وہ جو اس کے پاس موجود ہے۔ **خَيْرٌ**'' (ترجمہ:۔ بہتر ہے) ان لوگوں کے لئے۔ **مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ** (ترجمہ:۔ وہ کھیل تماشہ اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے) اور **لهو** سے مراد وہ چیز ہے جو دنیا کے کھیل و تماشے سے بہتر ہے اور وہ ہے بہترین حسینوں سے تزوج جنہیں ان سے پہلے کسی انس و جان (انسان و جن) نے نہ چھوا ہوگا۔ اور جو تجارت سے بہتر ہے وہ ثواب آخرۃ ہے جسے اللہ نے صالحین کے لئے تیار کیا ہے۔